اردو میں ترکی کے سفرنامے
(تہذیب وثقافت کے تناظر میں)

اظہر علی سید *

ABSTRACT:

Travelogues of a Muslim Country, Turkey, in Urdu Literature in the Cultural and Civilizational Perspective

Travelogues in urdu were written as early as in the 19th century.The travel account of Yousaf Khan Kambalposh, ''Tareekh-e-Yousafi", is known as the first travelogue in Urdu. The Travelogues have become a popular prose literature in urdu now and hundreds of travel accounts have been published till today.

In this article it is been attempted to highlight the travelogues of Turkey in the perspective of culture and civilization. Actually, when the Ottoman Caliphate was destroyed, Kamal Atta Turk declared the country a secular state. All the religious titles were abolished and the European culture and cilization was promoted under the Kamalism, while the majority of poeple belonged to and practiced the traditional Islam. This conflict is being depicted in travelogues of Turkey.

تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی سرزمینِ قسطنطنیہ، دنیا میں خاص اہمیت کی حامل رہی ہے۔کبھی یہ طاقت و سطوت کی علامت تصور کی جاتی تھی اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس کی حفاظت چونکہ ماورائی طاقتوں کے ذمے ہے اس لیے جنگی اعتبار سے یہ ناقابلِ شکست ہے؛ تو کبھی اس کی تسخیر کرنے والوں کو اخروی کامیابی کی نوید سنائی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوششیں خلافتِ راشدہ کے عہد سے ہی شروع کر دی تھیں، جو بالآخر ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح کے عہدِ حکومت میں ثمر آور ہوئیں۔

ساتویں عثمانی حکمران سلطان محمد فاتح سے لے کر خلیفہ عبدالحمید ثانی تک سلطنتِ عثمانیہ کا وجود قائم رہا۔لیکن جنگِ عظیم اوّل ۱۹۱۴ء کے آغاز کے ساتھ اس خلافت کا زوال شروع ہوا۔یوں تو اس جنگ کا خاتمہ ۱۹۱۸ء میں ہوا لیکن اس کے دوران ہی برطانیہ، روس اور فرانس نے ۱۹۱۶ء میں ان دستاویزات پر دستخط کیے جنھیں آج (Sykus Picot Agreements) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔یہ دستاویزات یا معاہدے درحقیقت سلطنتِ عثمانیہ کی تقسیم کے وہ خفیہ معاہدے تھے جن کے تحت مذکور بالا تینوں ملکوں نے سلطنتِ عثمانیہ کو باہم تقسیم کرنا تھا۔

* شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، رائیونڈ، لاہور　　برقی پتا: azharalisyed92@gmail.com

تاریخِ موصولہ: ۱۷/۸/۲۰۱۴ء

اس تمام صورتِ حال کے پیشِ نظر جب بیسویں صدی میں سلطنتِ ترکیہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی تو ہندوستانی سیاح نے سیاحت یا مختلف اغراض کے تحت اس ملک کا رخ کیا اور واپسی پر سفرنامہ نگار ہونے کا ثبوت دیا۔ان میں بیش تر وہ سیاح تھے جن کا مقصد سیاحت نہیں تھا لیکن سفرنامہ تحریر فرما کر ادبی خدمت سے عہدہ برا ضرور ہوئے۔دوسری طرف اس عہد میں اردو سفرنامہ بھی فنی اعتبار سے اس قدر مستحکم ہو چکا تھا کہ سفرنامہ نگاری اردو ادب میں روایت کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ذیل میں ترکی کے اہم سفرناموں کا تہذیب وثقافت کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔

مقامِ خلافت۔شیخ عبدالقادر

بلاشبہ شیخ عبدالقادر کا نام برصغیر پاک وہند میں علم وادب اور فکر ونظر کے اعتبار سے مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔بالخصوص بیسویں صدی کے آغاز میں جب مسلمانانِ ہند ابھی جدید علوم کی طرف راغب نہیں ہوئے تھے، اُس عہد میں رسالہ ''مخزن'' کے ذریعے ان کی فروغِ علم وادب کی خدمات کو نہایت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

یہ بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ تھا کہ جب تمام مسلم دنیا میں خلافتِ عثمانیہ کو عقیدت اور احترام کا درجہ حاصل تھا۔لیکن ہندوستانی مسلمان کے لیے یہ عقیدت ایمانی درجہ اختیار کر چکی تھی، شیخ عبدالقادر بھی اس جذبہ سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اسی وفورِ شوق کے تحت وہ ۱۹۰۶ء میں استنبول روانہ ہوئے۔جہاں وہ خلافتِ عثمانیہ کے تاریخی نوادرات اور سلطنتِ ترکیہ کے تہذیب وتمدن کا بچشمِ خود مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ڈاکٹر انور سدید نے شیخ عبدالقادر کے سفرِ ترکی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''شیخ صاحب ۱۹۰۶ء میں لندن کے سفر پر روانہ ہوئے تو مقامِ خلافت کو دیکھنے کی آرزو ان کے دل میں تڑپ رہی تھی۔شیخ صاحب ان مسلمان راہنماؤں میں سے تھے جن کے دل میں مسلمانوں سے حکومت چھن جانے کی کسک موجود تھی۔شبلی نعمانی کی طرح ترکیہ ان کا بھی محبوبِ نظر تھا۔''(۱)

اس اقتباس کے مطابق انور سدید یہ سمجھے ہیں کہ شیخ صاحب جب ترکیہ تشریف لے گئے تو اس وقت خلافتِ عثمانیہ کا انہدام ہو چکا تھا اور مسلمانوں سے حکومت چھینی جا چکی تھی، جس کی وجہ سے وہ مغموم تھے۔حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔شیخ عبدالقادر ۱۹۰۶ء میں لندن روانہ ہوئے تھے اور وہاں سے موسمِ گرما کی تعطیلات میں وہ ترکی تشریف لے گئے تھے اور تعطیلات کے اختتام پر انھیں واپس لندن آنا پڑا تھا۔جس کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں کہ ''عثمانیوں کی اخوت اسلامی نے غربت میں وطن کا سماں باندھ دیا۔دن گزرتے ہوئے معلوم نہ ہوئے۔۔۔تعطیلات کا زمانہ تمام ہوا۔لندن واپس پہنچنے کا وقت آ گیا۔''(۲) یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ترکی میں خلافت قائم تھی اور جنگِ عظیم اوّل کا ابھی آغاز بھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ''مقام خلافت'' میں ایسے حالات کا ذکر ہے۔ڈاکٹر خالد محمود بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہوئے بے غیر نہیں رہ سکے کہ شیخ صاحب کا سفرِ استنبول خلافت کے خاتمے کے بعد کا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''(شیخ عبدالقادر) انھیں سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کا بڑا قلق تھا۔ترکستان کی عثمانی حکومت ان کے نزدیک

سرمایہ افتخار تھی، اس کا زوال ایک بڑے نقصان کا عروج تھا۔ مسلمانوں سے حکومت چھن جانے کے بعد جب انھوں نے وہ علاقے دیکھے جہاں سے مسلم حکمرانوں نے دنیا پر صدیوں حکومت کی تھی، ۔۔۔تو بعض مقامات پر وہ جذباتی ہو گئے۔'' (۳)

اس سفرنامہ کے آخر میں شیخ صاحب نے ۲۸ جولائی ۱۹۰۶ء سے ۲۳ ستمبر ۱۹۰۶ء تک کا روزنامچہ بھی شامل ہے جس میں واضح طور پر تاریخوں کا اندراج ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر خالد محمود نے اپنی کتابوں میں اس روزنامچہ کا ذکر تاریخ اور سال کے ساتھ بھی کیا ہے۔

بلاشبہ سفرنامہ ''مقامِ خلافت'' فنی اعتبار سے جدید انداز کا ترجمان ہے کیونکہ اس سے پہلے اردو سفرنامہ تاریخ و جغرافیہ کے اعداد و شمار کی روایت اور حدود و قیود میں پابند تھا۔ اسی لیے ''مقام خلافت'' کو روایتی سفرناموں سے انحراف کی مثال قرار دیا جاتا ہے۔ جس میں مصنف نے سفر کی تیاری اور احوالِ سفر کو بیان کرنے کی بجائے اپنی سفری منزل کو مرکزِ نگاہ بنایا ہے۔'' (۴) درحقیقت مصنف نے جس عقیدت کے تحت ترکی کا سفر اختیار کیا تھا، اسی ذوق سے استنبول کے در و دیوار کو دیکھا اور بیان کیا ہے۔ استنبول کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

''مدت سے آرزو تھی کہ استنبول دیکھوں۔ آخر پوری ہوئی۔ اب تین ہفتے سے میں ہوں اور استنبول کی گلیاں۔ نہ وہ ختم ہوتی ہیں، نہ میرا شوق۔ یورپ کے اکثر سیاّحوں نے لکھا ہے کہ شہر تو لاجواب ہے مگر اس کی گلیاں خراب ہیں۔ گلیوں میں صفائی کا انتظام ٹھیک نہیں۔ ان سے بدبو آتی ہے۔ ان میں قدم قدم پر کتے لیٹے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی لیکن اگر انہیں اس شہر کی بے انتہا دلچسپیوں کی شناخت کے لیے آنکھ دی گئی ہوتی تو وہ ان عیوب سے قطع نظر کر کے اس کے محاسن کو دیکھتے اور اب بھی کئی قدر شناس سیاحوں نے بے حد داد دی ہے۔'' (۵)

مذکورہ بالا میں مصنف نے یورپین کی اس روش کا ذکر کیا ہے جس کے تحت انھیں مسلم ممالک میں کوئی حسن و خوبی نظر نہیں آتی۔ دراصل دوسروں میں قبح اور معائب تلاش کرنا چنداں مشکل نہیں ہوتا لیکن محاسن دیکھنے کے لیے جس راست فکری اور صحت مندانہ اندازِ نظر کی ضرورت ہوتی ہے وہ اہلِ یورپ میں مسلم ممالک کے حوالے سے کم ہی دیکھی گئی ہے۔

شیخ عبدالقادر کا استنبول میں قیام تقریباً سات ہفتے رہا۔ اس دوران مصنف نے شہر کی تاریخی عمارات کے علاوہ استنبول کی مساجد، تعلیمی مدارس اور ترک تہذیب و ثقافت کا بغور مشاہدہ کیا۔ مصنف ترک تہذیب و ثقافت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اکثر گھروں میں عورت کا لباس یورپ کا لباس ہے۔ یہاں تک کہ امراء اور اہلِ دولت کے ہاں بیگمات کے کپڑے پیرس سے بنوائے جاتے ہیں۔ مگر اوپر سے ان کا پردہ پوش کے برقعہ انہیں پھر ایشیائی بنا دیتا ہے گو اب برقعہ کی تراش خراش بھی ایسی ہوگئی ہے کہ اس کی قطع انگریزی گون کی سی نکلتی آتی ہے۔'' (۶)

مذکور بالا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی ترک معاشرت پر مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات

غالب تھے اور خاص طور پر یہ محسوس ہوتا تھا کہ ترکی کا طبقہء امرا اس مغربی رنگ میں مکمل ڈھل چکا تھا، ان کا طرزِ زندگی مغربی معاشرت کا نمونہ تھا۔ لیکن مشرقی طرزِ حیات ابھی ترکوں کی زندگیوں سے خارج نہیں ہوا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس عہد میں ترکی تہذیبی اعتبار سے مشرق و مغرب کا امتزاج تھا۔ یہ امتزاج مقامی باشندوں کے گھروں کی طرزِ آرائش و زیبائش سے لے کر ان کی وضع قطع اور لباس سے بھی عیاں ہوتا تھا۔ خوش حال ترک جہاں اپنے گھروں میں ایک کمرا نماز پڑھنے کے لیے پاک وصاف رکھتے تھے، جس میں وہ موزے یا گرگابی پہن کر جاتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ یورپی تمدن کے مطابق کھانے کے لیے میز کرسی کا بھی استعمال کرتے تھے۔ لیکن میزوں پر کھانا چننے اور کھانے کا انداز مشرقی تھا۔ شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''اکثر جگہ پر چھڑی کا نٹا بھی میز پر دیکھنے میں آیا ہے مگر بعض جگہ چمچے اور کانٹے صرف کھانا بڑی رکابیوں سے نکالنے کے لیے برتے جاتے ہیں۔ کھانے والے ہاتھ سے کھاتے ہیں۔۔۔ اسی طرح کھانے سے پہلے ہاتھ اگر صاف ہوں تو کھانے سے پہلے انہیں دھونا ضروری نہیں سمجھا جاتا اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے یا منہ صاف کرنے کا تو رواج یورپ میں بہت کم ہے۔''(۷)

اس زمانہ میں ترکوں میں مشرقی اور مغربی روایات کا اشتراک نظر آتا تھا۔ بالخصوص اخلاق و آداب کے سلسلے میں ترک مشرقی اقدار اور روایات کے حامل تھے۔ مصنف کے مطابق ترک باشندے آداب اور تکلفات کے معاملے میں لکھنو اور حیدرآباد سے بڑھے ہوئے تھے۔ اس معاشرے میں عام طور پر بزرگوں کو نہ صرف جھک کر سلام کیا جاتا تھا بلکہ اُن کے ہاتھوں پر بوسہ بھی دیا جاتا تھا۔(۸) تعلیم اور ترقی کے اعتبار سے ترک خواتین نہ صرف مردوں کے شانہ بشانہ تھیں بلکہ خواتین کی ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے مصنف اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ عثمانی خواتین آج کل اسلامی دنیا کی پیش رو ہیں۔(۹) پردہ کے سلسلے میں عام طور پر ترکی میں مسلم اور غیر مسلم خواتین میں دوپٹہ سے فرق کیا جاتا تھا کیونکہ مسلمان عورتیں دوپٹہ اوڑھتی تھیں جب کہ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والی خوتین اس کا کوئی خیال نہیں رکھتی رکھتی تھیں۔ لیکن مسلمان خواتین پردہ کے سلسلے میں حجاب کی پابند تھیں۔ اس بارے میں وہ یوں بیان کرتے ہیں:

''ترکوں میں لڑکی جب تک بیاہی نہ جائے اُس وقت مجاز ہے کہ منہ پر نقاب ڈالے فراجا اوڑھے رہنا اس کے لیے کافی ہے کوئی بہت ہی حیادار ہوئی اس نے نقاب گرالیا۔ ورنہ جو نہ گرائے اس کا عمل خلافِ رواج نہیں۔''(۱۰)

دراصل ترک معاشرے میں خواتین کے مکمل پردے کا آغاز شادی کے بعد ہوتا تھا۔ اس سے پہلے دوپٹہ یا فراجہ اوڑھنے کا رواج تھا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ''مقامِ خلافت'' کو منضبط سفرنامہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ کسی بھی طرح کی زمانی ترتیب اور تسلسل کو قائم رکھنے سے قاصر ہے۔ بلکہ یوں نظر آتا ہے کہ جیسے مصنف نے مختلف عنوانات کے تحت لکھے ہوئے الگ الگ مضامین کو یک جا کر کے کتابی صورت میں پیش کر دیا ہے جب کہ سفرنامہ کے لیے کسی ترتیب و تسلسل کا پابند ہونا

ضروری خیال کیا جاتا ہے۔یوں بھی اس بات کی تصدیق خود مصنف نے اپنی تصنیف میں یوں کر دی ہے کہ ان کی کتاب کو سفرنامہ اور سیاحت نامہ نہ سمجھا جائے کیونکہ یہ محض چند ہفتوں کے مشاہدات و واقعات کا مجموعہ ہے۔(۱۱)

دو ہفتے ترکی میں۔سید ابوالحسن علی ندوی

یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے جب سید ابوالحسن علی ندوی کو دمشق یونیورسٹی نے علمی افادے کے لیے اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔دمشق سے واپسی پر انھیں ماضی کی سلطنتِ عثمانیہ کی سیاحت کا شوق بیدار ہوا اور وہ ترکی تشریف لے گئے۔یاد رہے کہ سید ابوالحسن علی ندوی کا تعلق اُس جادہء علم سے ہے جو سلیمان ندوی سے ہوتے ہوئے شبلی نعمانی کے مکتبہء علم وفکر سے جا ملتا ہے۔ یہ اسی مکتبہء علم وفکر کا اثر تھا کہ انھیں بھی اسلامی تاریخ اور مسلم تہذیب وتمدن سے ویسے ہی قلبی لگاؤ تھا جیسے ان بزرگوں کو تھا۔جس کا ثبوت تھا کہ جب بھی مصنف کو کسی مسلمان ملک کے سفر کا اتفاق ہوا تو انھوں نے ہمیشہ وہاں اسلامی تاریخ اور تہذیب کے جلوؤں کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔گویا کہ ایسا کرنا وہ اپنا دینی اور ملّی فریضہ خیال کرتے تھے۔سفر نامہ ''ترکی میں دو ہفتے'' ان کے اسی نصب العین کا آئینہ دار ہے۔

جب مصنف ترکی گئے،ان دنوں جمہوریہ ترکی کو کمال اتاترک کی کمال زدگیوں کے نتائج کا سامنا تھا۔جس کے تحت ملک لادینیت کی رو میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ایسے تمام شعائر کو ختم کر دیا گیا تھا جن سے اسلامی تشخص کا اظہار ہوتا تھا۔مزید برآں ایسے تمام اقدامات کو بروئے کار لایا جا رہا تھا جن کے ذریعے مغربی تمدن کو ملک میں فروغ حاصل ہو۔یہی وجہ تھی کہ ترکوں کی اکثریت وضع قطع،لباس،زیبایش وآرائش،نشست و برخاست اور طعام و قیام یعنی ہر طرح سے یورپی انداز اختیار کر چکی تھی حتی کہ مساجد کے آئمہ بھی اس سے متاثر نظر آتے تھے:

> ''نماز کے بعد شیخ عمر بیلن سے ملاقات ہوئی،اس وقت تک وہ کسی مسجد کے امام اور واعظ معلوم ہوتے تھے، عربی لباس،عربی عمامہ،باہر نکلے تو عربی لباس اتار کر کوٹ پتلون اور انگریزی ٹوپی میں،جس سے وہ اچھے خاصے کنگ ایڈورڈ معلوم ہوتے تھے۔''(۱۲)

مذکور بالا کے مطابق ترک علما مذہبی حلیہ صرف نمازوں کے اوقات میں ہی اختیار کرتے تھے اور اس کے بعد عام لوگوں کی طرح مغربی انداز واطوار کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ایک بار مصنف اور ان کے ساتھیوں نے ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کا ارادہ کیا تو ان کے ترک گائیڈ نے انھیں بتایا کہ یہاں کھانا کھانا اس لیے مناسب نہیں کیونکہ اس ہوٹل میں شراب کا استعمال عام ہے۔جس پر مصنف نے ایک مسلمان ملک میں ایسا وقت پیش آنے پر نہایت افسوس کا اظہار کیا(۱۳) دراصل ۱۹۲۳ء میں جب کمال اتاترک نے سیکولرازم کا نعرہ بلند کیا تھا تو جبراً ایسی تمام اقدار کو ختم کر دیا گیا تھا جن سے کسی بھی طرح اسلامیت کا اظہار ہوتا تھا۔مصنف کے مطابق ترکی میں لادینیت کا انقلاب برپا کرنے والے کمال اتاترک کے مقبرے کا یہ عالم تھا کہ ''عمارت کے کسی گوشہ اور عبارت کے کسی شوشہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی مسلمان کا مقبرہ اور کسی مسلمان کی قبر ہے۔''(۱۴)

ان تمام کوششوں کے باجود ترک حکومت لوگوں کے دلوں سے اسلام پسندی کے رجحانات کو ختم کرنے میں ناکام رہی تھی۔ کیونکہ اتاترک کی وفات کے بعد ملک میں لادینیت کے خلاف آواز بلند ہونا شروع ہوگئی تھی۔اس سلسلے میں عدنان مندریس وہ پہلے وزیرِاعظم تھے جنھوں نے مذہبی پابندی کے خاتمے کی بھرپور کوششیں کیں تھیں۔مصنف کے مطابق عدنان مندریس کی کوششوں کے نتیجے میں جب ترکی میں ان پابندیوں کے خاتمے کا اعلان کیا گیا تو شکرانے کے طور پر لوگوں نے خوشیاں منائیں:

''لوگ بیان کرتے ہیں کہ جس وقت برسوں کے بعد پہلی بار عربی میں اذان ہوئی تو ترک سن کر بیخود ہو گئے۔لوگوں نے اس بیخودی وسرمستی میں سڑکوں پر سجدے کیے۔ہزاروں مینڈھے اور بکرے اس خوشی میں ذبح ہو گئے۔'' (۱۵)

درج بالا اقتباس سے ترکوں کی اسلام سے محبت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں لوگ طبعاً اسلام پسند تھے لیکن اتاترک اور اس کے ساتھیوں نے اصطلاحات کے پردے میں لوگوں کو جبراً اسلام سے دور کر رکھا تھا۔

ابوالحسن علی ندوی کا یہ سفرنامہ درحقیقت ان کی مبلغانہ مساعیِ جلیلہ کی عکاسی کرتا ہے جس میں وہ ماضی کی سلطنتِ عثمانیہ کا جمہوریہ ترکی سے موازنہ کرتے اور ماضی کو حال کے دریچوں سے آواز دیتے سنائی دیتے ہیں۔یاد رہے کہ ان کا یہ موازنہ ان کے مزاج کی مذہبی جہت اور اسلام پسندی کو نمایاں کرتا ہے۔اس سفرنامہ کی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے معلومات کی صداقت کو حتی المقدور ممکن بنانے کے لیے نہ صرف مختلف دفتروں اور اداروں کا خود مشاہدہ کیا بلکہ کئی ترک علماء اور دانش وروں سے ملاقاتیں کرنے کے بعد اپنے تاثرات کو قلم آرا کیا ہے۔اس طرح یہ سفرنامہ اپنی صدق بیانی کی بنیاد پر بلاشبہ وقیع مقام کا حامل ہے۔جس پر اظہار وبیان کی سادگی اور صداقت نے اس سفرنامے کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔

ترکی قدیم وجدید۔خلیل احمد حامدی

خلیل احمد حامدی کا سفرنامہ ''ترکی قدیم وجدید'' پہلی بار اسلامک پبلی کیشنز،لاہور سے ۱۹۷۲ء کو طبع ہوا۔خلیل احمد حامدی صحافیوں کے ایک وفد کے ہم راہ عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ معظّمہ گئے۔جہاں سے مولانا مودودی کے نام الریاض یونیورسٹی اور رابطہ عالمی اسلامی کا دعوتی پیغام لے کر لندن روانہ ہوئے۔کیونکہ مولانا مودودی ان دنوں لندن میں زیرِ علاج تھے۔راستے میں ترکی کی سیاحت کے لیے رکے تو انھیں اطلاع ملی کہ مولانا صحت یابی کے بعد پاکستان واپسی کا پروگرام تشکیل دے چکے ہیں۔اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مصنف نے ترکی میں ہی ان کا انتظار کرنا مناسب خیال کیا۔

دراصل مصنف کے دل میں عثمانی ترکوں کے تہذیبی مراکز اور باقیات دیکھنے کی شدید خواہش تھی۔کیونکہ ماضی قریب کی یہ سلطنت مسلمانوں کے شاندار عہد کی علامت تصور کی جاتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ سفرنامہ میں مصنف نے ترکی کو قدیم اور جدید کے تناظر میں دیکھتے ہوئے اس فرق کو نمایاں کیا ہے جو سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد اتاترک نے ملک میں تہذیبی سطح پر نمایاں کیا تھا۔

مصنف جماعتِ اسلامی سے وابستہ ہونے کے سبب ایک نظریاتی فکر ونظر کے حامل تھے اور خلافتِ عثمانیہ ان کے نزدیک مسلمانوں کے عروج وزوال کی علامت تھی۔یہی وجہ ہے کہ وہ ترکی کی سیاحت کے دوران خلافت کی بازیافت کے

لیے پُر امید نظر آتے ہیں۔ مصنف کی اس امید کو تقویت اس وقت ملتی ہے جب وہ ایک مقامی سکول کا مشاہدہ کرنے جاتے ہیں اور وہاں مصنف کی تقریر کے دوران طلبا نے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا:

''...اسلام اور اسلامی جہاد اور اسلامی عظمت کی بحالی کے الفاظ پر جی بھر کر تالیاں بجائیں۔ پاکستان اور سعودی عرب میں تو اسلام کا نعرہ لگا دینا کوئی مشکل نہیں ہے۔ مگر ترکی کے نوجوان نسل کے اندر جس کی پرورش ہی لادینی دستور، لادینی نظامِ حکومت، لادین تہذیب اور لادین حکمرانوں کے زیر اثر ہوئی ہے۔ اس کا اسلام کے نام پر اس قدر اُچھل پڑنا فی الواقع ایک زبردست عجوبہ سے کم نہیں ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ اسلام کا احیاء ترکی کی تنگ و تاریک گلیوں میں ہو رہا ہوگا۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ کھلے بازار میں اسلام کا نعرہ عِحق گونج رہا ہے۔ مسجد سے بھی یہ آواز اُٹھ رہی ہے اور مدرسہ سے بھی۔'' (۱۶)

اس اقتباس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ عام طور پر ترک اسلام کے شیدائی تھے جس کا اظہار دورانِ تقریر ان کے والہانہ جذبات سے ہو رہا تھا۔ حامدی ان طلبا کے جذبات دیکھ کر اس ملک کے بارے میں مستقبل بینی کرتے ہیں کہ اسلام ہی اس ملک کا مستقبل ہوگا نہ کہ مغرب۔ مصنف کے مطابق یہ لوگ فقط اسلامیت کے دعوے دار ہی نہ تھے بلکہ ان کے عمل سے ان کی مذہب پسندی کا ثبوت ملتا تھا۔ کیونکہ مصنف کے قیام کے دوران جب ماہِ صیام کی آمد ہوئی تو انھوں نے دیکھا کہ ترکی میں ماہِ رمضان کی رونقیں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھیں۔ تمام مساجد روشنیوں سے بقعہ نور بنی ترکوں کی ایمانی حرارت کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ مسجدوں میں دن رات قرآن کریم کی محافل سے ایک سرور آفریں نظارہ پیش کر رہی ہوتی تھیں۔ (۱۷)

بلا شبہ اس معاشرے میں بعض عناصر ایسے بھی تھے جو شرعی اعتبار سے اسلامی تہذیب اور مذہبی معاشرت سے متصادم تھے جیسے خواتین کی آزادی وغیرہ۔ اس سلسلے میں مصنف کا خیال ہے کہ صحیح مسلمان عورتیں اپنے گھروں سے نہیں نکلتی جب کہ بازاروں، دفتروں اور محفلوں کو رونق بخشنے والی عورتیں مسلمان نہیں بلکہ ان کا تعلق یہودیت، ارمن یا عیسائیت سے تھا اور اگر مسلمان بھی تھیں تو وہ ایسے گھرانوں سے تھیں جو دنیا کو ترجیح دیتے ہوئے اِس کی ہر بُری بھلی کو قبول کر چکے تھے۔ (۱۸) در حقیقت اس صورتِ حال کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ترکی ایشیا اور یورپ کا سنگم ہونے کی وجہ سے دونوں تہذیبوں کے اثرات کا امتزاج تھا۔ لوگ دین کے ساتھ دنیا کی ہم آہنگی کو معیوب خیال نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مصنف استنبول اور انقرہ کی معاشرت اور تمدن کو دیکھ کر سخت متعجب ہوا کہ یہاں کے باشندے عجب تضاد کا شکار تھے:

''یہ شہر ہے تو مسلمانوں کا مگر اسی تضاد سے لبریز ہے جو کراچی، قاہرہ عمان اور طرابلس میں نظر آتا ہے۔ مسجدوں میں جا کر طبیعت خوش ہوتی ہے کہ حاضرین میں نوجوانوں اور پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت ہے۔ بازاروں میں معاملہ بالکل الٹا ہو جاتا ہے۔ عورتوں کے نیم عریاں لباس، نوجوانوں کی آوارہ گردی، مردوں اور عورتوں کا بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلنا، یہ سب وہ مظاہر ہیں جو بے خدا قوموں کی اجتماعی زندگی میں پائے جاتے

ہیں۔۔۔اگر استنبول اور انقرہ پر اسی تہذیب کا غلبہ رہا تو ترکی صحیح اسلامی تہذیب کا گہوارہ کیسے بن سکے گا۔''(۱۹)

یہاں مصنف اُس تضاد کو بیان کرتے ہیں جو مسلم ممالک کے مرکزی شہروں میں تہذیب وتمدن کی صورت میں عام نظر آتا ہے۔ایک طرف مذہبی سرگرمیوں کا مظاہرہ تو دوسری طرف مغربی تمدن کی عمل داری ان کی زندگی کا حصہ ہوتی ہے۔یہی مشرق اور مغرب کی کشمکش اپنی پوری قوت کے ساتھ استنبول اور انقرہ میں برسرِ پیکار تھی۔ایک طرف مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوئی تھیں تو دوسری طرف لوگ یورپی تہذیب وتمدن کو بقائے حیات کے لیے لازم خیال کیے ہوئے تھے۔

مصنف ترکوں کی مہمان نوازی اور خاطر داری نے بہت متاثر کیا۔اس سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ یہ وصف اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن کے اثرات کا نتیجہ ہے۔حامدی ترک مسلمانوں کے اس قلبی اخلاص اور یگانگت کو روحانی وحدت کا نام دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ'' یہ اخوت درحقیقت صرف اسلام کی بدولت ہے جو زبان،رنگ ونسل اور وطن کی تقسیم کو یک سر مٹا دیتی ہے۔''(۲۰)

خلیل احمد حامدی کا یہ سفرنامہ درحقیقت سلطنتِ ترکیہ کا ایسا منظرنامہ ہے جس میں ترکوں کو ان کی مذہبی سرگرمیوں کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔اس کے علاوہ مصنف نے اس ملک میں تمام مذہبی افعال واعمال کو ایک بامعنی انداز میں دیکھتے ہوئے ان سب کوششوں کو احیائے اسلام سے تعبیر کیا ہے۔اسے مصنف کی دین سے وابستگی ہی کہنا چاہیے کہ انھوں نے اپنے موضوع سے ہٹ کر ترک معاشرے کے کسی تہذیبی اور تمدنی پہلو پر نظر اٹھانا بھی گوارا نہیں کی۔حامدی کی اس حکایتِ سفر پر دینی عقیدتوں کے اثرات غالب ہیں جو کسی ادبی یا فنی آرائش وزیبائش کے محتاج نہیں ہیں۔

مولانا روم کے دیس میں۔ظفر اقبال بھٹی

ظفر اقبال بھٹی کا سفرنامہ''مولانا روم کے دیس میں'' پہلی مرتبہ ۱۹۹۰ء میں مکتبہ علیمیہ لاہور سے طبع ہوا۔یہ سفرنامہ درحقیقت ان کے زمانہ طالب علمی کی یاد ہے جب وہ تعلیمی اغراض کے تحت ترکی کے شہر انقرہ تشریف لے گئے تھے۔جہاں وہ دو سال تک''میٹو'' (METU)(مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونی ورسٹی) میں زیرِ تعلیم رہے۔اس قیام کے دوران بلاشبہ وہ زیادہ وقت اپنی جامعاتی مصروفیات میں سرگرداں رہے۔لیکن اس مصروفیت میں بھی وہ اپنے ذوقِ سیاحت کی تسکین کا سامان پیدا کرتے رہے۔جس سے یہ سفرنامہ یونیورسٹی کی حدود سے نکل کر ترکی کے تاریخی اور سیاحتی مقامات کی بھی سیر کراتا ہے۔اس سفرنامہ میں مصنف ترکی کے تاریخی اور سیاحتی مقامات کو ایک مورخ کی نظر سے دیکھتے ہوئے ترک تہذیب وتمدن کا جائزہ لیتے ہیں۔جدید تہذیب کے تضاد کو واضح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''ترکی ایک مسلم ملک ہے جس کی تاریخ نہایت سنہری ہے۔پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میں کسی مختلف ترکی میں آ چکا ہوں۔کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی اور چلتی پھرتی لڑکیاں اور خواتین میری توجہ کی پہلی چیز تھیں۔سر پر کٹے ہوئے نہایت سلیقے سے سجے بھورے بال،چہرے پر میک اپ کی حسبِ ضرورت تہہ،مردانہ وار قمیضیں،گھٹنوں تک آئی ہوئی اسکرٹ اور نیچے آزاد ٹانگیں،ہاتھوں میں سگریٹ اور ہونٹوں پر حسبِ مزاج مسکراہٹ ہوسکتا تھا کہ

میں انہی کو دیکھتا رہ جاتا لیکن مشرقیت اور شرم کا عنصر مجھ پر حاوی ہو گیا۔'' (۲۱)

درج بالا کے مطابق ترکی ایک مسلمان ملک ہونے کے باوجود تمدن کے اعتبار سے مغرب کا نمونہ تھا۔ جہاں معاشرتی آزادی اس قدر تھی کہ مشرقی اقدار اور اوصاف کا کہیں دُور دُور تک نشان نہ تھا۔ خواتین اسکرٹ اور جینز پہنتی تھیں جب کہ مرد حضرات بھی مغربی لباس زیبِ تن کیے نظر آتے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے پینٹ کوٹ ان کے قومی لباس کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ کیونکہ لباس کے معاملے میں تمام ترک یکساں تھے یعنی چپراسی سے لے کر صدرِ مملکت تک، حتیٰ کہ مساجد کے آئمہ بھی پتلون کوٹ میں ملبوس نظر آتے تھے۔ آئمہ کے لیے صرف سیاہ گاؤن اور سرخ وسفید رنگ کی عمامہ نما ٹوپی مخصوص تھی۔ جب کہ اس ملک میں ڈاڑھی رکھنا؛ عام لوگوں کی طرح مساجد کے آئمہ کے لیے بھی ممنوع تھا۔ (۲۲)

دراصل لادینی نظام کے نفاذ کے بعد ملک کے تمام مذہبی اداروں پر حکومت کی سخت نگرانی شروع ہو گئی تھی۔ اس لیے آئمہ کے تقرر سے لے کر ان کے لباس اور ظاہری وضع قطع تک، سب کو سیکولر آئین کا پابند بنایا گیا تھا۔

ترکی میں مغربی اثرات کا نتیجہ تھا کہ جا بجا ریستوران، ہوٹلز اور ریسٹورنٹ نما شراب خانے سجے نظر آتے تھے۔ ان میں رنگا رنگ سجی ہوئی ممنوع مشروبات کی بوتلیں، اس ملک کی تہذیبی زندگی کا مظہر تھیں۔ ترکی میں سگریٹ نوشی کثرت سے کی جاتی تھی۔ اس کے لیے کسی عمر اور جنس کی قید نہ تھی بلکہ یہاں تک کہ طلبا کو دورانِ امتحان بھی سگریٹ نوشی کا شغل جاری رکھنے کی اجازت تھی۔ کیونکہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ''اس طرح سے طلبہ اپنے ذہنی تناؤ کو دور کر رہے ہیں۔'' (۲۳)

درحقیقت یہ سفرنامہ ظفر اقبال کی تعلیمی مصروفیات کی روداد ہے جس میں مصنف نے اپنے فرصتِ اوقات اور تفریحات کا ذکر کر کے اسے سفرنامہ کا درجہ دیا ہے۔ ظفر اقبال بھٹی کا یہ خاصا ہے کہ انھوں نے ترکی کو اس کی تاریخ یا مذہب کے تناظر میں دیکھنے کی بجائے لمحہء موجود میں دیکھا ہے اور اس کی تہذیبی اور تمدنی ترقیات اور ترجیحات کو کوئی مذہبی اور اخلاقی معنی ومفہوم دیتے نظر نہیں آتے۔ یہی وصف ایک سیاح کا حسنِ صداقت ٹھہرتا ہے۔

زبانِ یارِ من ترکی۔ اقتدار احمد

اقتدار احمد کا سفرنامہ ''زبانِ یارِ من ترکی'' پہلی بار ۱۹۹۵ء میں مکتبہ وحدتِ ملی، لاہور سے طبع ہوا۔ یہ سفرنامہ مصنف کے اس سفر کی روداد ہے جب وہ ۱۹۹۴ء میں اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ (آئی۔ایم۔اے) کے دوسرے بین الاقوامی کنونشن میں شرکت کے لیے ترکی گئے تھے۔ یاد رہے کہ مصنف کا یہ سفر ڈاکٹر اسرار احمد کی معیت میں تھا۔ اقتدار احمد کا یہ سفرنامہ معنوی اعتبار سے دو حصوں پر مشتمل ہے۔ جس کا پہلا حصہ مصنف کی آپ بیتی سے تعلق رکھتا ہے جب کہ اس کا دوسرا حصہ کنونشن کی روداد پر مشتمل ہے۔ مصنف ترک تہذیب وتمدن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' کہنے کو تو مشرق اور مغرب گلے ملتے ہیں لیکن یہاں مشرق مارے انکسار کے بچھ گیا اور مغرب اس کی چھاتی پر سوار ہے۔ مغربیت مشرقیت کے سینے پر گویا مونگ دل رہی ہے۔ خانہ جنگی سے پہلے بیروت کی تو بات اور تھی دمشق میں

تقریباً یہی حال دیکھا اور قاہرہ کی پوش آبادیوں میں بھی صورتِ حال زیادہ مختلف نہ تھی۔لیکن یہاں دنیا کے اس واحد شہر پر جو دو براعظموں میں واقع ہے یورپی تہذیب کے اس اضافی رنگ کی چھاپ بھی ہے جو بے حیائی کی آخری حدوں کی نشاندہی کرتا ہے۔نوجوان جوڑے ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے سڑکوں فٹ پاتھوں اور پارکوں میں مٹرگشت اور خوش فعلیاں کرتے نظر آتے ہیں۔عریانی خطرے کے نشان سے بس ذرا نیچے ہے۔''(۲۴)

مذکور بالا اقتباس میں مصنف نے یہ واضح کیا ہے کہ بیروت، دمشق اور قاہرہ، مسلم ملکوں کے شہر ہونے کے باوجود یورپی تہذیب وتمدن کے حامل تھے لیکن ترکی کے شہر استنبول اور انقرہ پر مغربی تہذیب کا غلبہ ان شہروں سے زیادہ تھا۔ جہاں سڑکوں اور پارکوں میں نوجوان جوڑے ایسی حرکات کرتے نظر آتے تھے جنھیں مشرق میں بے حیائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔مصنف کے خیال میں اس کی بنیادی وجہ ترکی کا یورپ سے جغرافیائی انسلاک تھا۔جب کہ اس کی دوسری اہم وجہ یہ بھی تھی کہ خلافتِ عثمانیہ کے دورِ زوال میں مغرب کی طرف سے مسلسل ایک پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا جس میں سلطنتِ ترکیہ کو 'یورپ کا مردِ بیمار'' کہا جاتا تھا۔دراصل اس کی وجہ ترکوں کو نفسیاتی اعتبار سے مشرقی اقدار سے متنفر اور اس قوم کو ذہنی اعتبار سے مغلوب کرنا تھا۔

مصنف نے ترک تہذیب وثقافت کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اس ملک میں خلافت کے خاتمے کے بعد سیکولرازم کو فروغ دیا گیا۔جس کے تحت تمام اسلامی احکام کی ادائیگی کو موقوف کر دیا گیا تھا۔لیکن اب اس ملک میں مذہبی احکام اور اقدار کا احیا شروع ہو چکا تھا۔جیسے اذان اور نماز باجماعت کا باقاعدہ اہتمام کیا جانے لگا تھا۔مصنف لکھتا ہے:

''اذان اور اس کے بعد موذن کی طرف سے ساؤنڈ سسٹم پر ہی پڑھی گئی مسنون دعا کے خاتمے تک مسجد تقریباً بھر چکی تھی،بالکل ویسے ہی جیسے جمعہ کے لیے ہمارے ہاں کی مساجد اذانِ ثانی کے بعد یعنی عربی خطبہ کے دوران بھری پڑی نظر آتی ہیں۔میں نے حساب لگایا تو نمازیوں کی تعداد اڑھائی تین ہزار کے درمیان تھی اور یہ حساب کتاب اپنے انجینئرنگ کے پس منظر اور تجربے کی بنا پر کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا۔''(۲۵)

ترکی مسلم اکثریت کا ملک ہونے کے باوجود یہاں یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں بھی موجود تھی۔جن کی تعداد سے ان کے ماننے والوں کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

اقتدار احمد کا سفرنامہ ''زبانِ یارِ من ترکی''اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں مصنف نے ترک تہذیب پر یورپی غلبے کو دینی حمیت سے دیکھا ہے اور اس اندازِ معاشرت پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ بلاشبہ اقتدار احمد نے بعض تاریخی مقامات کے عقب سے تاریخ کی بازیافت کی ہے۔لیکن جب وہ ترکوں کے ماضی اور حال کو دیکھتے ہیں تو محوِ حیرت ہو جاتے ہیں کہ آج اس مسلم ملک کی تہذیب وتمدن کو کون سا نام دیا جائے۔فنی اعتبار سے یہ سفرنامہ روداد نویسی سے تعلق رکھتا ہے جس میں مصنف نے اپنی ترکی میں آمد کی وجہ کو نہایت اخلاص سے نبھایا ہے۔لیکن مصنف کے اس اسلوبِ نگارش سے سفرنامہ کا کینوس محدود ہو کر رہ گیا ہے۔جسے پڑھتے ہوئے قاری تشنگی کا احساس شدت سے کرتا ہے۔

ترکی میں عباسی۔قمر علی عباسی

اکیسویں صدی کے سفر نامہ نگاروں میں قمر علی عباسی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔کیونکہ ان کے کثیر التعداد سفر نامے ان کے ذوقِ سیاحت نوردی کا ثبوت ہیں۔مسافرانہ مزاج کے باعث نہ ان کے پاؤں میں ٹھہراؤ ہے اور نہ نظر میں یکسوئی۔ بلکہ وہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے مسافر کی طرح مناظر کو دیکھتے اور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔درحقیقت پڑاؤ اور ٹھہراؤ ان کے مزاج کا خاصا نہیں ہے۔

زیرِ نظر سفر نامہ ''ترکی میں عباسی'' ان کے سفرِ ترکی کی یادگار ہے جو ویلکم بک پورٹ، کراچی سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ فنی اعتبار سے یہ سفر نامہ ان کے دوسرے سفر ناموں سے منفرد ہے۔کیونکہ اس میں مصنف نے سفر نامہ کے فنی لوازمات اور اسلوب کو نبھانے کی کوشش کی ہے۔اس کے ساتھ تحریر کی شگفتگی ،طنز اور ظرافت کی آمیزش ؛ جو عباسی کی تحریر کی صفات ہیں، وہ اس میں بھی برقرار نظر آتی ہے۔

مصنف کے مطابق ترکی کا شہر استنبول تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے ملک کے تمام شہروں سے مختلف تھا۔ یہ وہی شہر ہے جس کی تسخیر کے لیے مسلمانوں نے مختلف ادوار میں متعدد کوششیں کیں لیکن بار یاب نہ ہوئے۔عباسی لکھتے ہیں:

> ''استنبول ایک پرانا شہر ہے ۳۵۰۰ قبل مسیح آباد ہوا۔یہاں یونانی آئے ،رومن کا قبضہ رہا۔پھر یہ دولت عثمانیہ کے جھنڈے تلے رہا۔اس کا نام قسطنطنیہ تھا۔رسالت مآب ﷺ کی حدیث ہے۔''تم ضرور قسطنطنیہ کو فتح کر لو گے اور فوج بھی خوب ہے۔اس کا امیر بھی خوب ہے۔'' آپؐ نے فرمایا ''میری امت کی پہلی فوج قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگی اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا ہے۔''(۲۶)

اس اقتباس میں مصنف نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ مسلم عساکر نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی جو بار بار کوششیں کی تھیں ان کا مقصد مسلمانوں کے توسیع پسندانہ عزائم نہیں تھے۔ بلکہ اس کی بنیادی وجہ نبی کریم ﷺ کا وہ فرمان تھا جس میں آپؐ نے مسلمان فاتح کو جنت کی بشارت دی تھی اور اس بشارت کے حصول کا آغاز مسلمانوں نے حضرت عثمانِ غنیؓ کے عہد ۳۴ھ سے ہی شروع کر دیا تھا جو بالآخر ساتویں عثمانی خلیفہ سلطان محمد فاتح پر جا کر ختم ہوا تھا۔

خلیفہ سلطان محمد فاتح سے لے کر خلیفہ عبدالمجید دوم تک ترکی میں مسلم خلافت قائم رہی لیکن جنگِ عظیم اوّل کے خاتمے کے بعد سائیکس پیکوٹ اگریمنٹس (Sykus picot Agreements) کے تحت خلافتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیے گئے اور ۳ مارچ ۱۹۲۳ء کو کمال پاشا اتاترک نے جدید سیکولر ترکی کی بنیاد رکھی۔

مصنف نے واضح کیا ہے کہ ترکی کے شہر استنبول اور انقرہ مغربی تمدن کا نمونہ تھے۔ جہاں لوگوں کے اندازِ خورد و نوش اور طرزِ وضع قطع مکمل طور پر یورپی تھے۔ترکی میں سیکولر نظام کے نفاذ کے بعد اتاترک نے سب سے پہلے خواتین کو آزادی کے نام پر گمراہ کیا تھا جس کا یہ نتیجہ تھا کہ آج استنبول میں لڑکے لڑکیاں بے غیر شادی کے اکٹھے رہ سکتے تھے اور اسقاطِ حمل کو

قانونی تحفظ حاصل تھا۔(۲۷)مصنف جب اتاترک کے مقبرے کی زیارت کے لیے گیا تو دیکھا کہ مقبرہ مکمل طور پر اتاترک کے نظریات کی ترجمانی کررہا تھا۔عباسی لکھتے ہیں:

''مقبرہ بہت بڑی جگہ میں تھا۔۔۔اندر قبر تھی۔اتاترک آرام کررہے تھے انکی تقریریں لکھی تھیں انگریزی میں ترجمہ بھی تھا۔انہوں نے فوج کو خطاب کیا تھا۔''ملک کی حفاظت کرنا اور سیکولرازم کی بھی جو ملک کی اصل ترقی ہے۔''حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہاں کوئی قرآنی آیت نہیں لکھی تھی''(۲۸)

مصنف کے لیے یہ بات باعثِ حیرت تھی کہ مقبرے کے اندر یا باہر کوئی قرآنی آیت نہیں لکھی ہوئی تھی۔بلکہ مقبرہ پر جو اتاترک کا خطبہ تحریر تھا وہ اس کی لادینی فکر کا اظہار کرتا تھا۔جس میں سیکولر نظام کو ملکی ترقی اور بقا کا ضامن قرار دے فوج کو وصیت کے طور پر یہ کہا گیا تھا کہ وہ اس لادینی نظام کے تحفظ کو یقینی بنائے۔

مصنف کے مطابق اس لادینیت کا اثر دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ترکی کے صرف بڑے شہروں میں زیادہ نظر آتا تھا جب کہ دیہاتی زندگی پر یورپی اثرات غالب تھے بلکہ دیہاتوں میں مذہبی تاثر نمایاں تھا۔بیش تر دیہاتی صوم وصلوۃ اور مشرقی اقدار کے پابند تھے۔(۲۹)

موجودہ صدی کے سفرنامہ نگاروں میں قمر علی عباسی، اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ ان کا اندازِ نظر عام سیاحوں کی نسبت جدا ہے۔سفرنامہ 'ترکی میں عباسی' درحقیقت ترکی کے عہدِ نو کا ذکر ہے۔جس میں مصنف نے اس ملک کو اس کے جدید رنگ وآہنگ میں دیکھا ہے اور ترک تہذیب وثقافت کے ان تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جس نے ترک معاشرت کو مغرب زدہ بنادیا تھا۔جہاں لوگ مشرقی روایات اور اقدار کو کلیتاً فراموش کرکے یورپ کی تقلید میں سرگرداں تھے۔مصنف ترک تہذیب کی اس قلبِ ماہیت کی بنیاد تلاش کرتے ہوئے اتاترک کے سیکولرازم پر جا پہنچتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس معاشرتی آزادی کی اصل بنیاد یہی لادینی نظام تھا۔عباسی کا یہ سفرنامہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں مصنف نے ترک تاریخ کو سبقاً بیان کرنے کی بجائے ایک مسافر کا انداز اپنایا ہے جو ہر چیز کو اچٹتی نظر سے دیکھتا اور آگے بڑھتا جاتا ہے۔بلاشبہ مصنف کے اسلوب کی شگفتگی اور برجستگی نے سفرنامہ کو نہایت دل کش اور دل نشیں بنادیا ہے۔یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عباسی کے اس سفرنامہ سے محظوظ ہونے کے لیے قاری کا ذہین الطبع اور زندہ دل ہونا ضروری ہے۔

سفرنامۂ ترکی۔ڈاکٹر فرید احمد پراچہ

بلاشبہ ڈاکٹر فرید احمد پراچہ کا معتبر ترین حوالہ جماعت اسلامی ہے اور اسی جماعت کے پلیٹ فارم سے ۲۰۰۹ء میں انھیں ترکی کے دورے پر بھیجا گیا۔بنیادی طور پر اس دورے کا مقصد ترکی میں اُن دو کانفرنسوں میں شرکت تھا،جس کا اہتمام ترکی کی سعادت پارٹی نے کیا تھا۔اس میں سے ایک 'جشنِ فتح استنبول' جب کہ دوسری کانفرنس کا انعقاد عالمی تنظیم اسلاف العالمی لنصرۃ القدس وفلسطین (International Colition To Sport Al-Qudus And Plestine) نے کیا

تھا۔یادر ہے کہ اس سفر میں ڈاکٹر عطاء الرحمٰن (سابقہ ایم این اے مردان) بھی ان کے ہم راہ تھے۔

اس طرح مصنف کے اس سفر کا مقصد سیاسی ہونے کے ساتھ تاریخی بھی تھا۔کیونکہ ان دونوں کا نفرنسوں کا تعلق امتِ مسلمہ کے شاندار ماضی اور حال سے تھا۔فرید پراچہ جہاں ترکی کو اس کے جدید رنگ و آہنگ میں دیکھتے ہیں وہاں وہ چشمِ تخیل سے فتح قسطنطنیہ کے تاریخ ساز معرکے کا نظارا کرنے لگ جاتے ہیں۔مصنف اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

''ہم اوپر ایک گول پلیٹ فارم پر پہنچے تو تاریخ ہمیں یک لخت چھ صدیاں پیچھے لے گئی۔ہمارے سامنے میدان جنگ سجا ہوا ہے۔تصاویر یا فلم کا نہیں سچ مچ کا۔ساحل سمندر پر کشتیوں سے مجاہد اتر رہے ہیں۔میدان جنگ گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج رہا ہے۔مجاہدوں کی تلواریں بجلی کی طرح چمک رہی ہیں۔فاتح استنبول سلطان فاتح کا سفید گھوڑا صفوں کو چیر کر آگے بڑھ رہا ہے۔ابھی جو توپ دھاڑی ہے اور اس سے نکلنے والے آٹھ من وزنی گولے نے فصیل میں بڑا شگاف ڈال دیا ہے۔''(۳۰)

مذکورہ اقتباس میں مصنف نے تاریخ کے اُس نادر واقعہ کو بیان کیا ہے جسے دنیا فتح قسطنطنیہ کے نام سے جانتی ہے۔ مصنف کے بیانیہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ اس معرکہ کو جنگ کے طور پر بیان نہیں کرتے بلکہ اسے بیان کرنے کے لیے وہ نہایت پُر شکوہ لہجے اور ایمانی تمکنت اظہار کرتے ہیں۔جس سے اسلام کی سربلندی اور عظمت مترشح ہوتی ہے۔ دوسری طرف مصنف نے تاریخ بیان کرنے کے لیے مؤرخانہ اسلوب کی بجائے ادبی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔فنی اعتبار سے اس تکنیک کو فلیش بیک کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔جس میں مصنف کسی واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے کہ جیسے وہ خود اس واقعہ کا حصہ تھا اور اس سارے عمل کا اس نے بچشمِ خود نظارا کیا ہو۔یہی وجہ ہے کہ فرید پراچہ نہ صرف اس جنگ کے منظر کو دیکھتے ہیں بلکہ انھیں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز تک سنائی دیتی ہے۔اس فنی حربے کے تحت مصنف نے تاریخ گوئی کی ثقالت سے اپنے بیان کی شگفتگی کو مجروح ہونے نہیں دیا۔

ترکی میں سلطان محمد فاتح سے لے کر ۱۹۲۳ء تک مسلم اقتدار کو غلبہ حاصل رہا لیکن جنگِ عظیم اوّل کے خاتمے کے بعد کمال اتاترک نے برسر اقتدار آنے کے بعد ملک کو لادینی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے مذہبی اقدار اور روایات پر پابندی عائد کر دی گئی۔مصنف ان پابندیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پھر ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ اذانوں کی آواز ختم کرنے، نماز باجماعت کے اہتمام کی صف لپیٹنے، دیواروں کو کھرچ کر پھر سے تصویروں کو نمودار اور نمایاں کرنے کا حکم جاری ہو گیا۔یہ حکم جاری کرنے والے کوئی عیسائی فاتحین نہیں تھے، کوئی وحشی تاتار نہیں تھے، کوئی چنگیز خان و ہلاکو خان نہیں تھے۔بظاہر مسلمانوں جیسا نام رکھنے والا ایک لیڈر مصطفٰے کمال اتاترک تھا۔ایا صوفیہ کو مسجد نہ رہنے دیا گیا اور پندرہ سو سال تک دو آسمانی مذاہب عیسائیت اور اسلام (اصلاً ایک ہی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی دین اسلام ہی تھا) کی عبادت گاہ رہنے والی

عمارت میوزیم میں تبدیل کر دی گئی۔۔۔۔انفرادی طور پر نماز ادا کرنے پر بھی پابندی رہی ہے۔''(۳۱)

مصنف کے مطابق کمال اتاترک نے ملک میں سیکولر نظام کے اجرا کے ساتھ ہی مساجد کی تالا بندی کر کے اذان اور نماز باجماعت کو موقوف قرار دے دیا تھا۔آیا صوفیہ کو نہ صرف بند کر دیا گیا بلکہ اسے ترک فوج کے گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا گیا۔صوم وصلوۃ کے علاوہ خواتین کے حجاب پر پابندی لگا دی گی، دینی تعلیم اور عربی زبان کو ممنوع قرار دے کر تعلیمی اداروں سے اسلامیات کے مضمون کو ختم کر دیا گیا۔بلا شبہ آیا صوفیہ کی بندش مسلمانوں کے لیے انتہائی حزیمت کا باعث تھی۔جس پر لوگ راتوں کو اٹھ کر روتے اور اس مسجد سے دوبارہ اذان کی آواز سننے کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔''(۳۲)

ترکی میں لادینی نظام کے نفاذ کے لیے فوج کی خدمات پیش پیش تھیں۔اس لادینیت کے اثر سے ملک میں ایسا وقت بھی آیا کہ مردے نہلانے ،نماز جنازہ اور نومولود بچوں کے کان میں اذان دینے والے بھی میسر نہ رہے تو عدنان مینڈریس نے اتاترک کے اس نظام کے خلاف آواز بلند کی اور ان پابندیوں کے خاتمے کے لیے جد جہد کی۔جس کے نتیجے میں ترکی میں دوبارہ اذان ونماز اور عربی زبان کی تعلیمات بحال کر دی گیئں۔مصنف کے ترک دوست نے بتایا کہ جب ترکی میں مسجدوں کے میناروں سے اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوئیں تھیں تو لوگ خوشی سے سڑکوں پر نکل آئے تھے اور ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرنے کے علاوہ شکرانے کے نوافل پڑھے اور قربانیاں بھی دیں۔(۳۳)

لیکن جب ۱۹۶۰ء میں ترکی میں دستوری حکومت کی تشکیل ہوئی تو عدنان مینڈریس کو اتاترک کے نظام کی خلاف ورزی کے جرم میں فوجی جرنیلوں نے پھانسی پر لٹکا دیا۔(۳۴) ملک میں اذان اور جماعت کی بحالی کے باوجود مسلمانوں کو اب بھی مکمل آزادی حاصل نہیں تھی:

> ''نماز پڑھانے کے لیے جو امام تشریف لائے وہ اگر چہ جبہ ودستار سے مزین تھے اور ان کی تلاوت قرآن مجید بھی بہت خوبصورت تھی اور وہ خود بھی بہت خوبصورت تھے لیکن وہ کلین شیو تھے۔ان کی داڑھی نہیں تھی۔نماز مغرب کے بعد ان سے ملاقات ہوئی۔۔۔داڑھی کے موضوع پر ان کے لہجے میں حسرت، تڑپ اور شدت موجود تھی۔کہنے لگے کاش ہم آپ لوگوں کی طرح داڑھی رکھ سکتے۔ترکی قانون کے مطابق سرکاری ملازم داڑھی نہیں رکھ سکتا چنانچہ ہم داڑھی کی اہمیت اور شرعی حیثیت جاننے کے باوجود اس سنت سے محروم ہیں۔''(۳۵)

مصنف کے مطابق ترکی میں مساجد کے آئمہ کلین شیو تھے۔کیونکہ اس ملک میں قانون تھا کہ سرکاری ملازم ڈاڑھی نہیں رکھ سکتے اور مسجدوں کے آئمہ بھی اس قانون کے پابند تھے۔آئمہ کے علاوہ ترکی میں بیشتر روحانی پیشوا بھی ڈاڑھی سے محروم تھے۔جیسے ترکی میں نورسی تحریک کے روحانی پیشوا خواجہ محمد فتح اللہ گولن نہ صرف خود ڈاڑھی سے محروم تھے بلکہ اپنے مریدین اور معتقدین کو بھی ڈاڑھی نہ رکھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔اس کے علاوہ خواجہ گولن نے اپنے فوجی مریدین کو اشارے سے نماز پڑھنے کا حکم بھی دے رکھا تھا۔تاکہ ان کی پیشانیوں اور گھٹنوں پر سجدوں کے نشانات نہ پڑیں۔کیونکہ ترکی میں نمازی

اور راسخ العقیدہ فوجی کی ترقی پر پابندی عائد تھی اور کئی مسلمان فوجی افسروں کو ملازمت سے محض اس لیے محروم کر دیا گیا تھا کہ وہ صوم وصلوۃ کے پابند تھے۔اس تمام صورتِ حال کے باوجود ترک اسلام سے والہانہ محبت کرتے تھے۔مصنف نے ان کی اس محبت کا مظاہرہ فتح استنبول کے جشن میں دیکھا جس کا وہ یوں ذکر کرتے ہیں:

''ازمت شہر کا اسٹیڈیم ترک عوام سے بھرا ہوا تھا۔ان میں مرد،عورتیں، بچے،بوڑھے سبھی شامل تھے اور نہایت پرجوش انداز میں نعرۂ تکبیر اللہ اکبر،اسرائیل مردہ باد،امریکہ مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔''(۳۶)

مصنف کے مطابق ترک تہذیب وثقافت پر اگرچہ مغربی اثرات غالب تھے اور یہ اثرات ان کے وضع قطع اور لباس سے نمایاں تھے۔جیسے تمام ترک لباس کے معاملے میں بغیر کسی تخصیص کے سب یورپ کی تصویر تھے کیونکہ پینٹ شرٹ،جینز اور سکرٹ ان کا قومی لباس تھا۔اس ملک میں ایک وقت یہ بھی تھا جب نجم الدین اربکان کی حکومت کی رکن پارلیمنٹ مروہ نامی خاتون کو پارلیمنٹ کی رکنیت سے صرف اس لیے محروم کر دیا گیا تھا کہ وہ حجاب پہنتی تھی۔مروہ نے بھی نشست قربان کر دی لیکن اپنی حیا قربان نہیں کی تھی۔مصنف کے مطابق ترکی میں اب اسلامی تہذیب کے احیاء کا رجحان فروغ پا رہا تھا۔کیونکہ اب ترکی میں وہ وقت نہیں رہا تھا جب استنبول اور انقرہ میں سرِ بازار خواتین کے سروں سے حجاب چھینے جاتے تھے۔بلکہ اب تو استنبول کے بازاروں میں سکارف اوڑھے خواتین عام نظر آنے لگی تھیں۔(۳۷)

زمانہ ماضی سے ترکی میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار کو جو قدر ومنزلت حاصل تھی وہ کسی اور بزرگ یا مزار کے حصہ میں نہیں آئی تھی۔ترک سلاطین کے عہد میں یہ رواج تھا کہ انتقالِ اقتدار کی رسم مسجد حضرت ابوایوبؓ انصاری کے مزار پر ہوا کرتی تھی۔اب یہاں کوئی اس طرح کی رسم تو ادا نہیں ہوتی تھی لیکن لوگوں کے دلوں میں اس مزار کی عقیدت اور احترام اسی طرح موجود تھا:

''ماحول وہی جو مزاروں کے اردگرد ہوتا ہے۔تسبیحوں،ٹوپیوں، دینی نوادرات اور روحانی تحائف کی دکانیں۔ عقیدت مندوں کی ٹولیاں،کبوتروں کے غول کے غول۔ان کے لیے دانا دنکا اور غٹرغوں کی صدائیں۔ عورتیں،مرد،بچے بوڑھے ہر کوئی مزار کی طرف رواں دواں۔''(۳۸)

ترکوں کی امتزاجی تہذیب (مشرق ومغرب) کا عکس وہاں کے معاشرتی رسم ورواج پر واضح نظر آتا تھا۔شادی بیاہ کے سلسلے میں ترکوں میں یہ روایت بالکل عجیب تھی کہ شادی والے دن دولہا، دلہن کو کرسی سمیت اٹھا کر چند قدم چلتا تھا۔کیونکہ اس رسم کا مدعا یہ تھا کہ کیا خاوند اپنی بیوی کا بوجھ اٹھا سکتا ہے؟

یہ رسم اس اعتبار سے منفرد تھی کہ بیوی کا بوجھ اٹھانے سے مراد ترکوں نے جسمانی بوجھ سمجھ لیا تھا۔جب کہ اس سے مراد بیوی کے نان ونفقہ کا بوجھ تھا۔یہاں مصنف نے یہ واضح نہیں کیا کہ دولہا کا اس جسمانی آزمائش پر پورا نہ اترنے کی صورت میں کیا حکم تھا؟اسی طرح بچوں کے ختنوں کے سلسلے میں بھی یہ رواج تھا کہ ختنے کے روز بچے کو دولہا کی طرح زرق برق لباس

پہنا کر بازار کا گشت کرایا جاتا تھا۔اس دوران بچے کے والدین اور رشتہ دار بھی اس بچے کے ہم راہ ہوتے تھے (۳۹)

فرید احمد پراچہ کا ''سفرنامہء ترکی'' تاریخ، مذہب اور ادب کے امتزاج سے ترتیب پاتا ہے جس میں مصنف نے سر زمینِ قسطنطنیہ کے ماضی، حال اور مستقبل کو ایک مسلمان کی آنکھ سے دیکھا اور بیان کیا ہے۔ یوں نظر آتا ہے جیسے مصنف کی مذہب وابستگی نے ان کی سوچ اور فکر کے تمام زاویوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیا ہو۔یہی وجہ ہے کہ اس سارے سفرنامہ پر ایک مذہبی کیف اور سرور کا غلبہ ہے اور اسی کیف وسرور میں وہ سلطنتِ عثمانیہ کی رودادِ سناتے چلے جاتے ہیں۔

اس سفرنامے کا نمایاں وصف مصنف کا اسلوب ہے جس نے اسے وقیع بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔مصنف کا اندازِ بیان سرتا سر ادبی چاشنی سے گھوندا ہوا معلوم ہوتا ہے۔بطورِ خاص تاریخ نگاری کرتے ہوئے مصنف اپنی تحریر کو ثقیل بننے نہیں دیتے۔کیونکہ اردو کے بیشتر سفرنامے تاریخ نگاری کے نیچے دبے نظر آتے ہیں۔جس میں سفرنامہ کی تلاش بسیار سعی کے بعد ممکن ہوتی ہے۔اردو میں ایسے سفرناموں کی تعداد بہت محدود ہے جس میں سفرنامہ کو بطورِ ادبی صنف قائم رکھا گیا ہو ورنہ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ سفرنامہ پڑھنے بیٹھیں تو اندر سے مورخ صاحب برآمد ہو جاتے ہیں جو تاریخ کا دامن تھامے قاری کو زبردستی پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔یا پھر سفرناموں کی دوسری قسم ایسی ہے جو بیسویں صدی کے اختتامی اور اکیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں مقبول ہوئی جس میں سفرنامہ نگاری کو افسانوی ادب بنا دیا گیا ہے۔لیکن فرید پراچہ کے ہاں یہ افراط وتفریط کہیں نظر نہیں آتی۔ بلکہ تحریر کی شستگی نے اسے خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔

سیاحت نامہ ترکی۔ملک مقبول احمد

''سیاحت نامہ ترکی'' کے مصنف مقبول احمد بنیادی طور پر شعبہ طباعت واشاعت سے وابستہ ہیں۔لیکن اس کے ساتھ انھوں نے علم وادب کا شوق بھی پال رکھا ہے۔مصنف جب اپنی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' کے ساتھ میدانِ ادب میں اترے تو احباب کو علم ہوا کہ مقبول احمد محض کتابیں شائع ہی نہیں کرتے بلکہ دل میں بھی اتارتے ہیں۔

یہ ۲۰۱۰ء کی بات ہے جب وہ اپنے اہل وعیال کے ہم راہ ترکی کی سیاحت پر روانہ ہوئے۔مصنف اپنے اس سفر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار شریف پر حاضری دینے کو میں اپنے لیے بڑی سعادت سمجھتا ہوں۔انہی کی عقیدت ومحبت مجھے کشاں کشاں استنبول لائی۔ورنہ میں کہاں اور یہ مقام کہاں! (۴۰)

اس سے بات واضح ہوتی ہے کہ مصنف کے اس سفر کا مقصد دراصل حضرت ایوبؓ انصاری کے مزار کی زیارت تھا۔ اس طرح ان کا یہ سفر عقیدتوں کا سفر تھا جو انھیں ترکی کھینچ لے گیا۔جہاں انھوں نے ہفتہ بھر قیام کیا اور ترک تہذیب وثقافت کا بخوبی مشاہدہ کیا۔

مصنف کے مطابق ترکی، نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے مشرق ومغرب کا سنگم تھا بلکہ تہذیبی اعتبار سے بھی یہ مشرقی اور

مغربی تہذیب کا امتزاج تھا۔ کمال پاشا اتاترک کے عہد میں یہ باقاعدہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ کسی مسجد میں نہ تو اذان ہوگی اور نہ نماز باجماعت بلکہ مساجد کو تالے لگا دیئے گئے تھے۔ لیکن مصنف کے خیال میں ترک مجموعی طور پر اسلام پسند تھے اور یہی وجہ تھی کہ اسلامی تہذیب وثقافت کے نمونے جا بجا نظر آتے تھے۔

''چھت پر کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد ہم نیچے ہال میں آئے تو اللہ اکبر کی آواز سنائی دی ... عصر کا وقت ہو گیا تھا جس میں نیلگوں پانی کا عکس بڑا خوبصورت تھا... وضو کے پانی کو ہوائی آلودگی سے بچانے کے لیے گنبد شیشے کا تھا، اس کی خاموش فضا میں ہم نے باجماعت نماز پڑھی اور سچی بات یہ ہے کہ بڑا لطف آیا۔ (۴۱)

مصنف کے مطابق اب ترکی کی مساجد میں اذانیں اور باجماعت نمازیں ادا کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ترکی میں بزرگانِ دین کے کثرت سے مزارات تھے اور یہاں مزارات کے ادب واحترام کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا۔ مصنف کے مطابق ترکی میں سب سے زیادہ تعظیم وتکریم حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار کی تھی۔ جہاں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ترکوں میں اس مزار کی نسبت ایک رسم بھی جاری تھی:

''ترکی کے نوجوان جو مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، اس مزار پر عقیدت واحترام سے حاضری دیتے ہیں اور یہ رسم بھی ابھی تک قائم ہے کہ شادی بیاہ کے بعد دولہا دلہن مزار شریف پر حاضری دیتے ہیں اور کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے دعائیں مانگتے ہیں، بہت سے لوگ تو اولادِ نرینہ کی پیدائش پر بھی یہاں آتے ہیں اور بچے کے ختنے پر بھی حاضری دیتے ہیں۔'' (۴۲)

مذکور بالا کے مطابق ترکی میں دوسرے اسلامی ممالک کی طرح بزرگانِ دین کے مزارات مرجعِ خلائق تھے۔ جہاں لوگ عقیدت اور احترام کے ساتھ حاضری دیتے اور دعائیں مانگتے تھے۔ اس کے علاوہ شادی شدہ جوڑے مزار پر حاضری دیتے اور اولادِ نرینہ کی دعائیں مانگتے تھے۔ پاک وہند میں بھی اسی طرح درگاہوں پر حاضری اور منتیں مانگنے کا رواج پایا جاتا ہے۔ لیکن ترکی میں اس کے علاوہ دوسرے مذہبی تہواروں اور خوشی کے ایام میں بھی مزارات پر حاضری دینے کو باعثِ برکت سمجھا جاتا تھا۔

مصنف کے مطابق ترک تہذیب وثقافت پر مغرب کا رنگ گہرا تھا۔ خاص طور پر ترکی کا طبقہء امرا مکمل طور پر یورپی تمدن کا نمونہ تھا اور یوں نظر آتا تھا کہ اس معاشرے پر یورپ کا رنگ روز بروز گاڑھا ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ بیش تر نوجوان نسل اسی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی تھی۔ جو مذہبی اقدار سے بیگانہ دکھائی دیتی تھی۔ لادینیت کا بھوت ان کے سروں پر سوار تھا۔ ترکی میں اکثریت اگرچہ مسلمانوں کی تھی مگر یہاں سیکولرازم کو سرکاری سطح پر مسلط کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ملک میں شراب نوشی اور شراب خانوں کی کھلے عام آزادی تھی۔ خواتین مغربی لباس میں نیم عریاں ہر دفتر اور بازار میں پائی جاتی تھیں۔ بوس وکنار کے مناظر بھی پبلک مقامات پر عام تھے۔ لیکن اس تمام صورتِ حال کے باوجود مصنف کا خیال ہے کہ ترکی میں عام لوگ اسلام کی جانب مائل تھے۔ کیونکہ انھوں نے بازاروں میں ایسی بے شمار خواتین کو دیکھا جو حجاب کا اہتمام

کیے ہوئے تھیں۔ایسی خواتین کی تعداد مغرب زدہ خواتین کی نسبت کہیں زیادہ تھی۔جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ترک قوم بنیادی طور پر اسلام سے قلبی لگاؤ رکھتی تھی۔(۴۳)

مصنف کا یہ سفر نامہ درحقیقت ان کی عقیدت کے سفر کی روداد ہے۔کیونکہ مصنف کے اس سفر کو اختیار کرنے وجہ حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار کی زیارت تھا۔''سیاحت نامۂ ترکی'' بنیادی طور پر بہ یک وقت دو سطحوں پر سفر کرتا نظر آتا ہے۔ایک طرف مصنف کی عقیدت تو دوسری طرف ان کا ذوقِ سیاحت۔وہ مسلسل ان دونوں سطحوں کو باہم متوازی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن اس میں خوبی یہ ہے کہ وہ اس عقیدت میں حقیقت کو فراموش نہیں کرتے۔یہی وجہ ہے انھوں نے ترکی کو کھلی آنکھ سے دیکھا ہے۔لیکن ان کی عقیدت ترک تہذیب و ثقافت کی پراگندگی کو نمایاں کرنے کی بجائے ڈھانپتی چلے جاتی ہے۔اسی لیے وہ جہاں کہیں تہذیبی برہنگی دیکھتے ہیں، ان کی مشرقیت انھیں نظریں جھکانے پر مجبور کر دیتی ہے۔فنی اعتبار سے اسلوب کی سادگی اور سلاست نے کسی ادبی حربے کا سہارا لینا مناسب نہیں سمجھا۔

(یہ مقالہ اردو میں ترکی کے تمام سفرناموں کا احاطہ نہیں کر رہا ہے۔جیسے عبیداللہ کیہر کا ''زبانِ یارِ من ترکی'' یا مبشر نذیر کا ''سفرنامۂ ترکی'' کا اس میں تذکرہ نہیں ہے۔مدیر)

مراجع وحواشی

(۱) شیخ عبدالقادر، مقامِ خلافت، ص۲۰۴، دہلی: مخزن پریس، (س۔ن)　(۲) شیخ عبدالقادر، ایضاً، ص۱۔۲
(۳) شیخ عبدالقادر، ایضاً، ص۱۶۵　(۴) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، ص۲۰۳، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، (س۔ن)
(۵) شیخ عبدالقادر، ایضاً، ص۲۰۵　(۶) شیخ عبدالقادر، ایضاً، ص۱۶۳　(۷) شیخ عبدالقادر، ایضاً، ص۱۶۴
(۸) ایضاً، ص۱۶۹　(۹) ایضاً، ص۱۶۱　(۱۰) ایضاً، ص۱۵۸　(۱۱) ایضاً، ص۶
(۱۲) ابوالحسن علی، ندوی، ترکی میں دو ہفتے، ص۱۰۰، لکھنو: مکتبہ اسلام، ۱۹۵۶ء　(۱۳) ندوی، ایضاً، ص۸۴
(۱۴) ندوی، ایضاً، ص۹۶　(۱۵) ایضاً، ص۸۲　(۱۶) حامدی، خلیل احمد، ترکی قدیم و جدید، ص۳۹، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۲ء
(۱۷) حامدی، ایضاً، ص۶۶　(۱۸) حامدی، ایضاً، ص۷۸　(۱۹) حامدی، ایضاً ص۱۹۷　(۲۰) حامدی، ایضاً، ص۸۷
(۲۱) بھٹی، ظفر اقبال، مولانا روم کے دیس میں، ص۱۶، لاہور: مکتبہ علیمیہ، ۱۹۹۰ء　(۲۲) بھٹی، ایضاً، ص۸۸
(۲۳) بھٹی، ایضاً، ص۴۷　(۲۴) اقتدار احمد، زبانِ یارِ من ترکی، ص۲۶، لاہور: مکتبہ وحدتِ ملی، ۱۹۹۵ء
(۲۵) اقتدار احمد، ایضاً، ص۱۵۵　(۲۶) عباسی، قمر علی، ترکی میں عباسی، ص۲۸، کراچی، ویلکم بک پورٹ، ۲۰۰۲ء
(۲۷) عباسی، ایضاً، ص۱۱۹　(۲۸) عباسی، ایضاً، ص۱۲۲　(۲۹) عباسی، ایضاً، ص۱۰۵
(۳۰) پراچہ، فرید احمد، سفرنامۂ ترکی، ص۱۰۹، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء
(۳۱) پراچہ، ایضاً، ص۳۹　(۳۲) پراچہ، ایضاً، ص۹۵　(۳۳) پراچہ، ایضاً، ص۶۳　(۳۴) پراچہ، ایضاً، ص۸
(۳۵) پراچہ، ایضاً، ص۹۵　(۳۶) پراچہ، ایضاً، ص۶۹　(۳۷) پراچہ، ایضاً، ص۵۴　(۳۸) پراچہ، ایضاً، ص۱۲۰
(۳۹) پراچہ، ایضاً، ص۵۴۔۵۵　(۴۰) مقبول احمد، ملک، سیاحت نامہ ترکی، ص۲۴، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۱۱ء
(۴۱) مقبول احمد، ایضاً، ص۹۸　(۴۲) مقبول احمد، ایضاً، ص۶۵　(۴۳) مقبول احمد، ایضاً، ص۵۶